

مولانا شفیق الرحمان سنہلی *

”برہمن“ کی پختہ زُناری بھی دیکھ!

بُش اور بلیر اینڈ کمپنی کو ”برابر کی چوٹ“ کا اب تک کوئی نہ مل رہا تھا۔ یہ کمی بالآخر عراق میں فلیوہ کے ابو مصعب زرقاوی نے پچھلے دنوں پوری کی۔ مگر افسوس کہ یہ کمی جس مقابلہ میں پوری ہوئی اس میں بھی جیت کمپنی کی ہوئی۔ زرقاوی برابرہ کر بھی ہار گئے۔ برابرہ اس معنی میں رہے کہ مسٹر بلیر نے اگر ان کے مطالبہ پر جھکنے سے انکار کیا اور شدید اندرونی دباؤ کے باوجود انکار پر قائم رہے تو زرقاوی نے بھی ہر طرف سے آنے والی اپیلوں کے دباؤ کا اسی ”ثابت قدمی“ سے مقابلہ کیا اور اپنا قول کہ ”عراقی عورتوں کو امریکن جیل سے نکلاؤ ورنہ تمہارا آدمی (کیٹینہ ہیگلے) جو ہمارے ہاتھ میں ہے قتل کر دیا جائے گا!“ پورا کر دکھایا۔ مگر زرقاوی برابری ثابت کر کے بھی اس لئے ہارے کہ انہوں نے جو کیا وہ نہایت افسوسناک عمل تھا۔ ان کے ہاتھ میں جو انگریز انجینئر تھا اس کا انہوں نے کوئی گناہ نہیں بتایا تھا۔ بلیر اور بُش کے گناہوں کے عوض ان کے ایک بے گناہ ہم قوم کا قتل سراسر گناہ تھا۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کئے جانے کی اس مہم کو تقویت بھی پہنچائی جس کے بادل اٹھا کر افغانستان اور عراق پر چڑھائی کی راہ نکالی گئی تھی۔ اور بلیر اس کے برعکس جیتے ہوئے یوں نظر آئے کہ یہ ان کے لئے ایک سخت آزمائش کا موقع تھا۔ اور اس موقع پر زرقاوی کی مانگ کے جواب میں جو فیصلہ انہوں نے کیا وہ گویا تلوار کی دھار پہ چلنا تھا۔ مگر ان کے منصب کا تقاضہ یہی تھا۔ ملک اور پارٹی کا وقار اس سے وابستہ تھا۔ سخت حالات میں بھی منصب کے تقاضوں سے وفاداری نہ چھوڑنا بڑائی دینے والی بات ہے۔

اس قصہ کے دن ستمبر کے آخری ہفتہ کے وہ دن تھے کہ مسٹر بلیر کی لیبر پارٹی کی سالانہ کانفرنس کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔ اور اس کانفرنس میں پارٹی کے ان لوگوں کی بھاری تعداد کا سامنا بلیر کو کرنا تھا جو عراق پر چڑھائی کے معاملہ میں پہلے دن سے بلیر پالیسی کے کھلے مخالف تھے اور اب حالات و شواہد نے بلیر کو تمام تر غلط اور ان کو صحیح تر ثابت کر دیا تھا ایسے میں ایک برطانوی شہری کی جان کا معاملہ جو بلیر پالیسی ہی کا نتیجہ تھا ایک بڑی جذباتی فضا ان جنگ مخالف لوگوں کے حق میں پیدا کر دینے والا معاملہ تھا۔ ان کے سوا ہیگلے کا خاندان بھی جہاں زرقاوی سے رحم کی اپیلیں کر رہا تھا وہاں اپنے وزیراعظم پر بھی یہ جان بچانے کے لئے دباؤ ڈالنے کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ٹی وی کیمرے ان کو پورا تعاون

دے رہے تھے۔ جیگلے کی بوڑھی ضعیف ماں روتی ہوئی بیٹے کی رہائی مانگتی اسکرین پر دکھائی جا رہی تھی۔ ایسے سخت دباؤ کے ماحول میں ایک جمہوری حکمران کے لئے آسان نہ تھا کہ وہ اپنے فیصلہ پر آخر تک قائم رہ جائے۔ بلیر نے یہ کمزوری دکھانے سے انکار کر کے یقیناً پالا جیت لیا۔ عراق پر امریکی فوج کشی میں ان کی شرکت کتنی ہی قابلِ مذمت ہو وہ ایک دوسری بات ہے۔ یہاں اس سے ایک بالکل الگ مسئلہ کی گفتگو ہے۔ یہ بحیثیت لیڈر ایک خاص کردار کا مسئلہ ہے۔ ٹونی بلیر نے ثابت کیا کہ وہ اس کردار کے معاملہ میں پوری طرح قابلِ اعتماد ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک شہری کی جان کھو کر آئندہ کے لئے ایسی مزید آزمائش کا راستہ بند بھی کر دیا اور ملک کا وقار بھی بچا لیا۔

اس آزمائشی منظر سے نظر بے اختیار اپنے یہاں کے اس منظر کی طرف جاتی اور اس ہوتی ہے جس میں قائدانہ کردار کی یہ صلاحیت و استقامت نہیں ملتی۔ امریکی برطانوی سامراجیت نے جب ۲۰۰۱ء میں افغانستان کا رخ کیا تو پڑوسی پاکستان میں جن لوگوں نے خود اس کے مقابلہ کا عزم ظاہر کیا اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس معاملہ میں ساتھ دینے کے لئے پکارا وہ حالات کی سختی سے رفتہ رفتہ اس قدر بدلے ہوئے نظر آ رہے ہیں کہ جیسے وہ لوگ کوئی اور تھے جنہوں نے اس وقت وہ باتیں کی تھیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے افغانستان پر قناعت نہ کر کے عراق کو بھی روند ڈالا ہے۔ مگر ان کا یہ فاصلہ بڑھانے والا عمل الٹا فاصلوں کو کالعدم کرنے والا ثابت ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ ۲۰۰۱ء میں جس افغانستان پر یہ لوگ عذاب بن کر نازل ہوئے تھے وہ طالبان کا افغانستان تھا۔ ”طالبان“ کا لفظ آپ سے آپ بھی ”مدرسہ“ سے ان کے رشتہ کی طرف اشارہ کرتا تھا پھر مدرسہ سے خود بھی آگے بڑھ کر ان سے اپنا رشتہ دکھا رہے تھے۔ طالبان سے فارغ ہوتے ہی امریکہ اور اسکے ساتھ ساتھ کم و بیش تمام مغربی ممالک نے ضروری جان لیا کہ ”طالبان“ سے آئندہ کے لئے اطمینان حاصل کرنے کا پاکستان (بلکہ دنیا بھر) کے مدارس کی ”اصلاح“ لازم ہے۔ ورنہ یہ ”نرسری اگر“ باقی رہی تو ”سر پھرے“ پھر ضرور نکلتے رہیں گے۔ اس سلسلہ میں ان کی یہ مرکزی سوچ کوئی راز نہیں کہ وہ یہاں کے دینی تعلیم کے نظام کو اس ”اعتدال پسند“ (Moderate) اسلام کی تعلیم کے نظام سے بدلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں جس کے فارغین کو ان کے اس تصور زندگی سے ہم آہنگی میں کوئی دقت نہ محسوس ہو جسے وہ ڈیموکریسی اور لیبرٹی وغیرہ کی اصطلاحات سے ادا کرتے ہیں۔

اس صورت حال میں توقع کی جاتی تھی کہ طالبان کو بچا لیتا اگرچہ پاکستان کے دینی قائدین کے بس کی بات نہ تھی۔ اور یوں وہ ایک ملک بھی الگ تھا۔ مگر یہ جو خود پاکستان کے مدارس نشانہ پر رکھے جا رہے ہیں ان کو تو وہ اپنے جیتے جی مغربی ”اصلاحات“ کا شکار ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ مگر ہم ایک حیرت زدگی کے عالم میں خبریں پڑھتے ہیں کہ مغربی ممالک کے سفارت کار ہمارے مدرسوں میں گھوم پھر رہے ہیں۔ اور نظامِ تعلیم کی جدید کاری کے لئے ہمہ جہت تعاون کی پیش کشیں ان کی زبانوں پر ہیں۔ دل پوچھتا ہے، کیا ان لوگوں کے لئے کسی بھی درجہ میں ہمارے ہمت افزاء رویہ کا

کوئی جوڑ افغانستان پر بمباری کے وقت والے ہمارے جذبات اور رویہ سے لگایا جاسکتا ہے؟ کسی کو اگر ان لوگوں کی ڈپلومیٹک زبان کے جادو سے کوئی دھوکہ ان کے مقاصد و عزائم کے بارے میں ہو گیا ہو تو مسٹر بلیر کی اسی کانفرنس کی تقریر پڑھ لینی چاہیے جس کا ذکر اوپر آیا۔

اس کانفرنس پر عراق کا مسئلہ چھایا رہا تھا اور جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا اس مسئلہ پر مسٹر بلیر کو خود اپنی پارٹی میں پہلے دن سے سخت مخالفت کا سامنا ہے اس کانفرنس کا موقع بظاہر ان کے لئے اس سلسلہ کی آزمائشوں کا آخری اور سخت ترین موقع تھا۔ مگر تمام سابقہ موقعوں کی طرح وہ اس بار بھی پار ہو جانے کی صلاحیت کا ثبوت دے گئے یا کہنے کہ قسمت ساتھ دے گئی۔ برطانوی صحافیوں اور تجزیہ نگاروں کے اندازوں اور ذرائع کے مطابق مسٹر بلیر کو اس کانفرنس کے لئے تقریر کی تیاری میں بذاتِ خود بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ اور کیس جس قدر کمزور تھا اور جیتنا بہر حال تھا تو اس کے لئے ضرور ایسا ہوا گا۔ اس تقریر میں یوں تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ مگر اصلاً جو چیز محنت طلب تھی وہ عراق پر جا پڑنے کا جواز ان سب باتوں کے باوجود بتانا جنہوں نے جواز کے لئے بنائے گئے سارے کیس کی بنیہ ادھیڑ ڈالی ہے۔ نیز اس تقاضہ کو رد کرنا کہ اب جو ناسازگار حالات وہاں پر ہیں ان کی بنا پر وہاں سے نکل آنا چاہیے۔ نکل آنے کے تقاضہ کو رد کرتے ہوئے جو کچھ موصوف نے کہا اس میں پاکستانی مدرسوں کا بھی صراحتہ ذکر خیر ہے۔ اور اس طور پر کہ ابھی عراق سے نکل آنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ جو عراق میں اور جہاں تہاں دہشت گردی سر اٹھائے ہوئے ہے اور ہماری مہم کا اصل ہدف وہی ہے اس کے تو سرچشموں تک ہمیں پہنچنا اور تباہ کرنا ہے اور ان سرچشموں میں سے ایک ہیں پاکستان کے مدرسے۔ لیجئے۔ تقریر کا یہ متعلقہ حصہ یہاں پڑھ لیجئے:

There are two views of what is happening in the world today. One view is that what is happening is not qualitatively different from the terrorism we have always lived with..... We try not to provoke them and hope in time they will wither.

The other view is that this is a wholly new phenomenon, worldwide terrorism is based on a perversion of the true, peaceful and honourable faith of Islam; that its roots are in the madrassas of Pakistan, the extreme form of the Wahabi doctrine of Saudi Arabia, in the former training camps of al-Qaeda in Afghanistan. If you take this view, the only path to take is to confront this terrorism, remove its root and branch and at all cost stop its acquiring the weapons to kill on a massive scale. (The Time 30 Sept. 2004)

ترجمہ: ”آج جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس کے بارے میں دو نقطہ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دہشت گردی کوئی نئی زالی چیز نہیں یہ ہوتی ہی آئی ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں کہ ان لوگوں کو چھیڑا جائے یہ خود ہی ختم ہو جائیں گے۔ دوسرا نقطہ نظر (جو خود بلیر صاحب کا ہے) یہ ہے کہ

ایک بالکل نرالا ظہور ہے۔ یہ عالمگیر نوعیت کی دہشت گردی ایک سچے پراسن اور قابل عزت زدین اسلام کی تحریف پر مبنی ہے۔ اور اس کی جزیں ہیں پاکستان کے مدرسوں میں سعودی وہابیت کی انتہا پسندانہ شکل میں اور القاعدہ کے سابق افغانی ٹریننگ کمپوں میں۔ اس نقطہ نظر کو قبول کیا جاتا ہے تو پھر واحد راہ عمل یہ ہے کہ اس دہشت گردی سے ٹکرایا جائے اس کی جڑوں اور شاخوں سب کا صفایا کیا جائے اور کسی بھی قیمت پر یہ نوبت نہ آنے دی جائے کہ اس کے ہاتھ میں وسیع پیمانہ پر مار دھاڑ کے ہتھیار آجائیں۔“

کیا اس اقتباس کو پڑھ کر بھی کوئی شبہ رہنا چاہیے کہ یہ جو ہمارے مدارس کے لئے مغرب کی چھاتیوں میں ایک دم سے ”دودھ اتر آیا“ ہے اس کا اصل مقصد کیا ہے؟ بش اور بلیر جو اس مہم کے پیشوا ہیں ان میں سے بلیر صاف بتا رہے ہیں کہ وہ مدرسوں کی موجودہ تعلیم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کو انہیں بزمِ عم خود اسی طرح جڑ سے اکھاڑ دینا ہے جس طرح افغانستان سے القاعدہ کے ٹریننگ کمپ صاف کر کے ”سابق“ بنا دیئے گئے۔

ہمیں تو یہی سمجھنا کچھ مشکل ہو رہا تھا کہ جنرل پرویز صاحب نے حکومت سنبھالنے کے بعد سے جو مدارس کی ”اصلاح“ کا علم اٹھایا تو ہمارے اہل مدارس اپنے رویہ سے یہ ظاہر کرنے کے لئے باوجود یہ کہ وہ اس سے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ جنرل صاحب سے کبھی یہ کیوں نہ پوچھ سکے کہ دستور پاکستان کی کون سی شق حکومت کو مجاز بناتی ہے کہ ان آزاد دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں کچھ اپنی منشا داخل کریں؟ ہم نے اس خیال کے ماتحت دستور پاکستان کی ورق گردانی بھی کی اور کوئی ایسی شق وہاں دکھائی نہ دی۔ یہاں نصاب تعلیم میں کوئی چیز ایسی داخل ہو جو دستور کی رو سے ناروا ہو تو حکومت اس کو بے شک کہے کہ اصلاح کی جائے۔ مگر اس کے ماسوا تو صرف ایک عام شہری والے حق سے بس رائے زنی جائز ہو سکتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن اب اس پر مزید جو یہ مغربی سفارت کاروں کے ساتھ معاملہ دیکھنے میں آ رہا ہے وہ تو یہ تاثر دیتا ہے کہ دل شاید ”نا توں“ تھا جو مقابلہ میں دم توڑ گیا ہے۔ فانانڈ وانا الیہ راجعون۔ اندیشہ گزر رہا تھا کہ اس میں کہیں دخل القاعدہ کی طرف منسوب ابو مصعب زرقاوی جیسے جیالوں کے طرزِ عمل کا نہ ہو جس کے حوالہ سے اسلام اور اسلامی تعلیم کے اداروں کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ کہیں اس پر وپیگنڈے کے دباؤ میں تو یہ دینی قیادت نہیں آگئی؟ خاص کر ایسے حالات میں کہ اندر خود اپنی حکومت بھی وہی ایجنڈا لئے ہوئے چل رہی ہے! لیکن ابو مصعب زرقاوی جیسے لوگ تو تمام تر جناب بش اور بلیر کی اس سفاکی کا ردِ عمل ہیں جس کی گواہ افغانستان کی اور عراق کی سرزمین ہے اور جس پر خود امریکہ اور برطانیہ کے لاکھوں لوگ اپنے صدر اور وزیر اعظم کو لعنت کناں اور شرمسار ہیں۔ امریکی صدر بش اپنی عالمی سطح کی ذمہ دارانہ حیثیت کے باوجود اگر دو تین ہزار امریکیوں کی موت پر اس قدر آپے سے باہر ہو سکتے ہیں کہ مفلوک الحال افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر بھی تسکین نہ پائیں تو عراق پر توڑی گئی ایسی قیامت سے جس کے لئے یہاں بھی بغیر جعل سازی کے میسر نہ تھا زرقاوی جیسے جوانوں کا عربوں میں نکل آنا اسے کیونکر بجز ردِ عمل ماننے کے ہم سے کوئی تیار ہو سکتا ہے؟ مگر انفسوس کے ایک خبر ہمارے اندیشہ کو یوں واقعہ اور حقیقت بتانے والی سامنے

آ کر رہی ہے۔ اور مسٹر بش اور بلیر کی اپنے ایک انتہائی شرمناک موقف پر ڈھٹائی کے ہم معنی مضبوطی کے مقابلہ میں انہوں کی پلک کا منظر دیکھ کر علامہ اقبال کا یہ نوحہ یاد آ گیا ہے۔

دیکھ مسجد میں نکلتے رشے تسبیح شیخ
بلکہ میں برہمن کی پختہ زتاری بھی دیکھ

یہ خبر اسلام آباد میں ۱۶ ستمبر کو منعقدہ ”پہلی بین المذاہب کانفرنس“ کے حوالہ سے ہے۔ ماہنامہ ”الشریعہ“ گوجرانوالہ شمارہ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں تفصیل سے نقل ہوئی ہے۔ اس کانفرنس کے داعی وفاق المدارس کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد حنیف جالندھری تھے، مولانا کے استقبالیہ کا جو اقتباس خبر میں دیا گیا ہے اس کے یہ دو تین جملے ہمارے موضوع گفتگو سے تعلق رکھتے ہیں۔

”انہوں نے مدارس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد معاشرہ کے اصلاح کا اہم ذریعہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دین و مذہب کا دہشت گردی سے کوئی واسطہ نہیں اور ہم سب ملک کو دہشت گردی کے خلاف کام کریں گے۔“

عام حالات میں ان جملوں کا ہر لفظ مکمل تائید کا مستحق ہے۔ مگر اس وقت امریکہ اور برطانیہ (یعنی جناب بش اور بلیر) نے دہشت گردی کی اصلاح کو مبہم رکھ کر (اور باوجود دنیا کے اصرار کے اس مفہوم کا تعین یو این او میں بھی نہ ہونے دے کر) جو ستم اس اصطلاح کی آڑ میں اپنی سامراجیت کا مقابلہ کرنے والوں پر ہر طرف توڑ رکھا ہے اس کے بعد اس مبہم ”دہشت گردی“ کے خلاف مزاحمت کا عہد کرنے کے لئے (حاکم بدہن) امریکہ اور برطانیہ کے پروپیگنڈا طاقت کے آگے سر ڈال دینے کے سوا دوسری تعبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ اللہم قوفی رضاک ضعفنا وخذا الی الخیر بنو اضینا ولا تکلنا الی انفسنا طرفۃ عین۔

اس گفتگو میں روئے سخن اگرچہ خاص پاکستان کی طرف ہو گیا ہے، جس کی وجہ مخفی نہ ہونی چاہیے۔ مگر پڑو ہندوستان کے اہل مدارس کے بارے میں بھی جو کچھ اسی طرح کی خبریں آنے لگی ہیں تو جو پاکستان والوں پر صادق آئے گا وہ یقیناً ان پر بھی۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلیوں کا جو سوال اٹھا ہوا ہے یہ لکھنے والا اصولاً اس کی تائید میں ہے۔ خود اس نے مدرسہ میں پڑھا اور احسان مند ہے۔ مگر روز بروز شدت سے محسوس کرتا ہے کہ اس نے جو وہاں پڑھا زمانہ کی دینی ضرورت کے لحاظ سے وہ کم تھا۔ مگر یہ تبدیلی اسلام کو مغربی تصور کے مطابق ”ماڈرن“ بنانے کے نقطہ نظر سے آئے اس سے اللہ کی پناہ!